حالات و مقامات

جناب عبد الهادی احمد صاحب

ترکیہ میں اسلام اور لادینیت کی کش مکش

ترکی میں ایک طرف اسلامی نظریات و تصورات زور پکڑ رہے ہیں اور دوسری طرف یہی چیز حکومت کے سربراہ، فوجی جرنیلوں اور لادینیت پسندوں کے لیے باعثِ تشویش بن رہی ہے۔ گذشتہ دنوں استنبول یونیورسٹی میں نئے تعلیمی سال کے آغاز پر تقریر کرتے ہوئے صدر ترکی کنعان ایورن نے دینی تحریکوں کے بڑھتے ہوئے اثرات کا ذکر خاص طور پر کیا۔ انھوں نے کہا:

"رجعت پسند مذہبی تنظیمیں مختلف بھیسوں میں اپنی سرگرمیوں میں اضافہ کر رہی ہیں۔ ہم اس صورتِ حال پر گہری نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔ میں نوجوانوں کو اس سے خبردار اور ہوشیار رہنے کی تلقین کرتا ہوں۔ ہماری یونیورسٹیوں کو رجعت پسندی اور مذہبی قدامت پرستی کے خلاف مضبوط قلعے بن جانا چاہیے"۔

چند روز بعد ترکی کے صدر نے ٹیلی وژن سے خطاب کرتے ہوئے قوم کو جن خطروں سے آگاہ کیا، ان میں کمونزم اور فاشزم کے ساتھ "مذہبی رجعت پسندی" کا نام بھی لیا۔ ٹی وی کے ناظرین نے اس تقریر کے دوران جناب ایورن کو شدید غصے میں دیکھا۔ خصوصاً اُس وقت اُن کے لہجے کی تلخی اور چہرے کا رنگ دیدنی تھا جب انھوں نے مذہبی طبقے کی "حماقتوں" کا ذکر کرتے ہوئے کہا

"یہ کیسی احمقانہ، جارحانہ اور غیر آئینی تجویز ہے جو کچھ لوگوں نے پیش کی ہے کہ قوم کے سربراہ کی حیثیت سے مجھے نماز جمعہ کی امامت کرنی چاہیے"۔

مذہبی تحریکوں پر کنعان ایورن کی تنقید کے بعد اخبارات اور ذرائع ابلاغ میں تو جیسے بھونچال سا آگیا۔ تیز و تند مضامین اور اداریے لکھے گئے اور دینی طبقے کی سرگرمیوں کو ملک و قوم کی سلامتی کے منافی قرار دیا گیا۔ اُدھر حکومت کی مخالف لادین جماعتوں کی بن آئی۔ انھوں نے مذہبی عناصر کی شوریدہ سری کو حکومت کی لاپروائی اور غفلت شعاری کا نتیجہ قرار دیا۔ بعض نے تو یہ تک کہہ دیا کہ مذہبی رجعت پسندوں کو تحفظ خود حکومت فراہم کر رہی ہے۔ سوشل ڈیموکریٹک پارٹی نے اپنی پریشانی کا ذکر یوں کیا:

"رجعت پسندی کا ہمارے ملک میں احیاء ہو رہا ہے۔ اس کے ارتقاء میں حکومت کا اہم حصہ ہے، خصوصاً نشریات کا کردار تو بے حد پریشان کُن ہے۔ اتاترک کی اصلاحات بالخصوص سیکولرزم سے بتدریج کنارہ کشی کی روش اپنائی گئی ہے۔ ہم ہر شعبے میں بنیادی اداروں کو بے جان کر کے عثمانی دَور کی طرف لوٹ جانا چاہتے ہیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ گذشتہ چند برسوں میں اسلامی قوتوں کو بار بار اندھی جبریت کا سامنا کرنے کے باوجود ترکی معاشرے میں خاصا نفوذ حاصل ہوا ہے۔ عام مسلمانوں میں اسلام سے شیفتگی میں اضافہ اور نوجوان نسل میں اسلام کی ترقی کے لیے جدوجہد کرنے کا شعور عام ہو رہا ہے۔ ایک معروف ترک صحافی کے بقول:

"سترہ اٹھارہ برس کے نوجوان اسلامی تحریکوں سے زیادہ آسانی اور زیادہ تیزی سے متعارف ہو رہے ہیں۔ اگرچہ متعین طور پر یہ بتانا مشکل ہے کہ معاشرے میں ان کا تناسب کیا ہوگا، لیکن یہ بات آسانی سے کہی جا سکتی ہے کہ کمیونزم پر پابندی کی وجہ سے میدان میں اُن کا مزاحم کوئی نہیں رہا۔"

اسلامی قوتوں کو نوازنے کا الزام لگانے والے لوگ کہتے ہیں کہ وزیراعظم ترگت اوزل خود مذہبی آدمی ہیں۔ اور ان کی پارٹی مدر لینڈ میں پروفیسر اربکان کی سابق ملی سلامت پارٹی کا اچھا خاصا گروپ شامل ہو چکا ہے۔ کچھ واقعات بھی بطور مثال پیش کیے جاتے ہیں جن سے بعض اصحابِ اقتدار کا دین کی طرف جھکاؤ ثابت کیا جاتا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ وزیر تعلیم

نے کھلے بندوں ڈارون ازم پر تنقید کی۔ سکولوں میں مذہبی تعلیم لازمی قرار دے دی گئی ہے بلکہ یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ عربی کو نصاب میں شامل کیا جائے۔

ایک معروف اخبار "حریت" نے انقرہ کے محکمہ امورِ مذہبی کو ہدف تنقید بناتے ہوئے لکھا ہے کہ اس محکمے نے ایسی کتابیں اور رسالے چھاپے ہیں جن سے لادینیت دشمنی (یعنی دین داری) کی بو آتی ہے۔ اخبار نے جن کتابوں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے ان میں "مسلمان عورت" اور "کتاب حج" کا فوری نوٹس لینے کا مطالبہ کیا ہے۔ "کتاب حج" کی ذیل کی عبارت کے حوالے سے اس کتاب کو خطرے کے الارم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ "خطرناک عبارت" ملاحظہ ہو۔

"آپ مسجد، مکتب یا دفتر میں داخل ہوں تو پہلے دایاں پاؤں اندر رکھیں اور غسل خانے، طہارت گاہ یا ہوٹل میں جائیں تو پہلے بایاں پاؤں اندر ڈالیں"۔

اخبار کے خیال میں حکومت کی ایسی مذہبی سرگرمیاں ناقابل معافی ہیں۔ اسی محکمے کی ایک اور غلطی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے "حریت" لکھتا ہے کہ ہر سال اس محکمے کے شائع کردہ قرآن کے ساٹھ ہزار نسخے فروخت ہو رہے ہیں۔

ترکی پریس کا یہ عجیب تضاد ہے کہ مذہبی سرگرمیوں کے خلاف تو ایسی شدت، مگر بے حیائی اور فحاشی کے فروغ کے لیے ہر قسم کی مساعی میں پیش پیش۔ یہاں تک کہ ترکی کو وہ پہلا اسلامی ملک ہونے کا اعزاز حاصل ہو گیا ہے جو امریکہ کا بدنام زمانہ عریاں جریدہ "پلے بوائے" اپنے ہاں شائع کرنے پر آمادہ ہو گیا ہے۔ اس سے پہلے یہ رسالہ امریکہ کے علاوہ چند یورپی ممالک ہی سے شائع ہوتا تھا۔ کئی دوسرے اخبار اور رسائل مثلاً ارکیک، بریود، گوز ٹے، تان، سیھا اور پلے مین (یہ رسالہ پلے بوائے کی طرز کا ہے) بھی شائع ہوتے ہیں۔ ان میں عریانی اور فحاشی کا باقاعدہ مقابلہ ہے۔ ملک میں بے حیائی کو روکنے کے لیے حکومت نے اسمبلی میں بل پیش کر رکھا ہے، لیکن ترک دوشیزاؤں کو عالمی مقابلہ ہائے حسن میں شریک ہونے کی عام اجازت ہے[1]۔ تازہ ترین اطلاع کے مطابق حکومت نے "پلے بوائے"

---

[1] پاکستان کی تحریکِ ترقیٔ نسواں کی بھی رال ایسی ہی عظمتوں کے لیے ٹپک رہی ہے (مدیر)

اور "پلے مین" کے خلاف کارروائی کا فیصلہ کیا ہے)۔

حریت کی طرح اخبار "ملیت" بھی اسلام دشمنی کا خصوصی نقیب ہے۔ یہ اکثر مسلمانوں کی شکایات حکام بالا کے سامنے پیش کرتا اور اتاترک کے معنوی بیٹوں کو خبردار کرتا رہتا ہے کہ وہ ہوشیار رہیں ورنہ اسلام کے نام لیوا ان کے ایوانِ تجدد کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔ گذشتہ دنوں "ملیت" نے اپنی ایک اشاعت میں ایسی نو پارٹیاں گنوائیں جو ترکی کے نظام کے لیے "تباہی" کا پیش خیمہ ہیں۔ ان پارٹیوں کو اخبار نے "مذہبی انتہا پسند تنظیموں (ACTIVIST RELIGIOUS ORGANISATIONS) کا نام دیا اور لکھا کہ یہ روز بروز زور پکڑ رہی ہیں۔ ان پارٹیوں میں کالعدم ملی سلامت پارٹی اور اس کے عسکری بازو اکلنجر "یورنس گرہ" (THE RAIDER) کو سب سے خطرناک بتایا گیا ہے۔ ملیت نے سیکورٹی کے انسپکٹر جنرل صفت اریکان کے ایک بیان کے حوالے سے لکھا ہے کہ پولیس ان "خطرناک" تنظیموں پر کڑی نظر رکھے ہوئے ہے۔ اور وہ جب چاہے ان پر ہاتھ ڈال سکتی ہے [1]" ملیت نے محمود ہوکا کے معاملے پر بھی توجہ مبذول کرائی ہے۔ محمود ہوکا معروف عالمِ دین اور نقشبندی تحریک کے رہنما ہیں۔ ملیت نے محمود ہوکا پر "فردِ جرم" عاید کرتے کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"انہوں نے استانبول کی فتح مسجد میں ۳۵۰۰ خواتین کے اجتماع سے خطاب کیا۔ تمام خواتین پردے میں لپٹی ہوئی تھیں۔ ہوکا نے انہیں ٹیلیوژن دیکھنے سے منع کیا۔ انہیں تنبیہ کی کہ جو لوگ فحاشی اور بے حیائی کے کاموں میں شریک ہوں گے، اللہ کے نور سے محروم رہیں گے، نیز تاکید کی کہ عورتیں مردوں کی مجالس، بالخصوص شراب نوشی کی محفلوں میں شرکت نہ کریں۔ مردوں سے ہاتھ نہ

---

[1] تحریک احیائے اسلام کے لوگوں کو امریکہ و روس کی زبان میں مذہبی انتہا پسند کہا جاتا ہے یا بنیاد پرست ـــ اور یہ ہر جگہ "خطرناک" شمار ہوتے ہیں۔ خود مسلمانوں کی نگاہ میں بھی۔ (مدیر)

ملائیں اور اجنبی مردوں سے بات بھی نہ کریں"۔

ایسے حالات میں یہ اللہ ہی کا فضل ہے کہ ترکی میں تحریک اسلامی کئی برس سے زیرِ سطح تموّج پیدا کر رہی ہے۔ کاش کہ ترکی اور دوسرے مسلم ممالک کے حکمرانوں کو یہ سادہ سا نکتہ سمجھ میں آ جائے کہ بار بار اُبھرنے والی ایسی عظیم تاریخی قوت کو دبانے کے لیے ہر چند سال بعد قومی قوت ضائع کرنے سے ہزار درجے بہتر یہ ہے کہ وہ اس کے تقاضوں کا احترام کرتے ہوئے نظام چلائیں۔ اس طرح مسلم ممالک کی توانیں داخلی تصادموں میں برباد نہ ہوں گی۔

اردن اور شام کا سمجھوتہ اردن و شام کے مابین حالیہ معاہدہ ہونے پر فوری خدشہ یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ شام میں انتہائی مصائب بھگتنے کے بعد اب اُردن میں بھی اخوان المسلمون پر ابتلا کا آغاز ہونے والا ہے (بلکہ دراصل ہو چکا ہے) کہا جاتا ہے کہ شام نے شاہ حسین سے یہ منوا لیا ہے کہ وہ شام سے بھاگ کر اُردن میں پناہ لینے والے اخوانیوں کی حمایت سے دست کش ہو جائیں گے۔ اور پی۔ ایل۔ او کے سربراہ یاسر عرفات کی دوستی سے منہ موڑ کر معاہدہ عمان ختم کر دیں گے۔

گزشتہ دہ سالہ دَور میں اُردن اور شام کے تعلقات بے خراب رہے ہیں۔ شاہ حسین شامی حکومت کو "مرتدوں کا ٹولہ" اور صدر اسد اُردن کو "مصنوعی وجود" کہتے رہے ہیں۔ یہ نفرت اُس وقت مزید شدت اختیار کر گئی تھی، جب شام نے اُردن میں اخوان کے کیمپوں پر حملے کرنے کے لیے باقاعدہ گوریلا دستے بنا لیے۔ اگرچہ سعودی شہزادہ عبداللہ کی کوششوں سے متوقع لڑائی ٹل گئی۔ لیکن کچھ ہی دنوں بعد بیروت میں اُردن کا ایک اعلیٰ افسر شامیوں نے اغوا کر لیا۔ اس کے جواب میں اُردن نے بہت سے شامی باشندے اس الزام میں گرفتار کر لیے کہ وہ شہزادہ بدران کو قتل کرنے کے لیے بھیجے گئے تھے۔ ۱۹۸۲ء میں شام کی بعثی فوج نے جب اخوان کے خلاف کارروائی میں ہزاروں افراد شہید کر دیئے اور ہزاروں ہجرت کر کے دوسرے ملکوں میں چلے گئے تو اس موقع پر شاہ حسین نے ان کی دلجوئی کی تھی۔ شاید اس وقت انہیں شام کے خلاف سرد جنگ لڑنے کے لیے اخوانیوں کی ضرورت تھی۔ اُردن اپنے مخصوص معاشی اور سماجی حالات کی بنا پر طویل مخاصمت کا متحمل نہ تھا۔ ملک معاشی طور پر مسلسل بحران سے

دو چار ہے اور مذہبی طبقے کا حکومت پر دباؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ کچھ برسوں سے اُردن کی جدید نسل تیزی سے اسلامی اثرات قبول کر رہی ہے۔ اخوان کا اثر و نفوذ بڑھ رہا ہے، اسلامی شعور میں اضافہ ہو رہا ہے، خواتین اور طالبات پردے کو اپنا رہی ہیں، لوگ اسلامی نظام اور انقلاب کی باتیں کر رہے ہیں۔ یہ حالات مصر کے سابق صدر سادات اور سوڈان کے نمیری کی طرح شاہ حسین کے لیے بھی پریشانی کا باعث ہیں۔ شام سے تازہ معاہدے کا یہی پس منظر ہے۔

اُردن کے نئے وزیر اعظم زید الرفاعی شام کے پسندیدہ شخص ہیں۔ گذشتہ دنوں شاہ حسین نے انہیں (وزیر اعظم کو) ایک خط لکھا جس میں یہ معنی خیز فقرہ بھی تھا کہ:

"مجھے اور ہمارے وطن کے لاکھوں دیانت دار بیٹوں کو دھوکا دیا گیا ہے۔"

انہوں نے "دھوکا دہی" کی تفصیل بتاتے ہوئے لکھا کہ مٹھی بھر بد دیانت افراد مذہب اور اس کی تعلیمات کی آڑ میں دھوکا دے رہے ہیں۔ شاہ حسین نے خبردار کیا کہ ان لوگوں کو زیادہ عرصے تک چھوٹ نہ دی جائے گی۔ اس خط کو اُردن کے ٹیلی وژن اور شام کے ریڈیو سے نشر کیا گیا۔ شاہ حسین کے خط کا جواب وزیر اعظم رفاعی نے یوں دیا کہ وہ شاہ کے احکام کی پیروی کریں گے اور دھوکا بازوں سے اچھی طرح نمٹ لیں گے۔ اسی کے بعد زید الرفاعی دمشق گئے اور حافظ اسد سے مذاکرات کیے۔ جن کے نتیجے میں مذکورہ معاہدہ عمل میں آیا۔

اخوان اور "مذہبی لبادے" میں "دھوکا" دینے والوں کو سبق سکھانے کے لیے پہلا قدم یہ اُٹھایا گیا ہے کہ اُردن کے ایوانِ نمائندگان نے متفقہ طور پر ایک مسودۂ قانون کی منظوری دی ہے جسے تبلیغ، رہنمائی اور مساجد میں تدریس کا قانون ۱۹۸۵ء کا نام دیا گیا ہے۔ اس قانون کے ذریعے تبلیغ کرنے والوں، خصوصاً مساجد میں وعظ کہنے والوں پر یہ پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں کہ آئندہ وہ حکومت کی مرضی اور حکم کے منافی تقریر نہ کر سکیں گے۔ وہ "حکمت و دانش" کے خلاف کوئی بات نہ کریں گے اور انہیں دوسروں پر اعتراضات اور تنقید کرنے کا حق نہ ہوگا۔ اس قانون کے ذریعے ائمہ، خطیبوں اور دوسرے مبلغین کی مکمل طور پر زبان بندی کا سامان کر لیا گیا ہے۔ خلاف ورزی کی صورت میں قید اور جرمانہ کیا جا سکے گا۔

بھارت کے مسلمانوں کا بے مثال اتحاد

شاہ بانو کیس اس لحاظ سے بابرکت ثابت ہوا کہ اس کے

خلاف احتجاج کرتے ہوئے پندرہ کروڑ بھارتی مسلمان جسد واحد کی طرح متحد ہو گئے۔ دکن سے لداخ تک ایک ہی آواز گونج رہی ہے۔ "مسلم پرسنل لا میں مداخلت بند کرو"۔ اس مداخلت نے مسلمانوں کے ذاتی جھگڑے اور اختلافات ختم کر دیے ہیں۔ اگرچہ بھارتی حکومت نے احتجاج کو دبانے کے لیے کچھ سرکاری وظیفہ خواروں کو استعمال کرنے کی بھی کوشش کی۔ ایسے لوگ بھی سامنے آئے جن کے نام مسلمانوں جیسے تھے، مگر جن کی شہرت سکہ بند کمیونسٹوں کی ہے۔ ان میں حمید دہلوی کی بیوہ بھی تھیں کہ جو اپنی لاش دفنانے کے بجائے جلائے جانے کی وصیت کر چکی ہیں۔ ایسے لوگوں کے بیانات کو سرکاری پریس نے خوب اچھالا۔ ریڈیو اور ٹیلی وژن سے ان کی تشہیر کی گئی۔ لیکن اس سے مسلمانوں کے بے مثال اتحاد میں رخنہ اندازی نہ ہو سکی۔

بھارت کے مسلمان اب اس بات پر تُل گئے ہیں کہ اس مسئلے کا مستقل حل یہ ہے کہ آئندہ وہ اپنے مقدمات متعصب اور لادین عدالتوں میں لے کر نہ جائیں گے اور اپنے لیے علیحدہ شرعی عدالتوں کے قیام کا مطالبہ کریں گے۔ اس ضمن میں ایک تجویز تو یہ آئی ہے کہ حکومت تمام عدالتوں میں مسلم جوڈیشل بنچ قائم کرے، لیکن اس سے بھی خطرہ ہے کہ شاید مداخلت کے امکانات باقی رہیں۔ لہٰذا یہ تجویز بھی زیر غور ہے کہ مکمل خود مختار اسلامی عدالتیں قائم کی جائیں۔ بہار اور کیرالہ میں ایسی عدالتیں پہلے ہی خوش اسلوبی سے کام کر رہی ہیں۔ مسلم پرسنل لا بورڈ نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ ملک کے مختلف حصوں میں شرعی عدالتیں قائم کرے گا۔ اس سلسلے میں ایک تجویز یہ بھی سامنے آئی ہے کہ مساجد میں بنیادی عدالتی یونٹ قائم کیے جائیں۔ ان عدالتوں کو چلانے کے لیے ہر سال ہزاروں کی تعداد میں دینی مدارس سے فارغ ہونے والے طلبا اور علما کی خدمات حاصل کی جا سکتی ہیں، لیکن اس کے لیے ان حضرات کو جدید قوانین اور معاصر نظریات کی تعلیم دلانا ضروری ہے۔

مسلمانوں کے احتجاج اور ملی یگانگت کا ایک نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ اب اعلیٰ سرکاری حلقے بھی اس مسئلے کی سنجیدگی کو محسوس کرنے لگے ہیں۔ بھارتی وزیر اعظم مسٹر راجیو گاندھی کا تازہ ترین انٹرویو اس ضمن میں خاصا حوصلہ افزا ہے۔ تامل زبان کے پندرہ روزہ "تغلق" کو انٹرویو دیتے ہوئے

مسٹر گاندھی نے کہا:

"مسلمانوں نے مجھے اپنے نقطۂ نظر سے آگاہ کرنے کے لیے ایک تفصیلی یادداشت پیش کی تھی اُسے دقتِ نظری سے پڑھنے کے لیے تو وقت نہیں، البتہ اس سے بنیادی طور پر جو کچھ مجھے معلوم ہو سکا ہے، وہ یہ ہے کہ ان کا اپنا قانون ہمارے موجودہ قوانین سے کہیں زیادہ عورتوں کے حقوق کی حفاظت کرتا ہے۔ ہم اُن کے قوانین کو اپنے قوانین کا حصہ بنا سکتے ہیں۔ یہ ممکن ہوا تو مسئلے کا بہترین حل خود بخود نکل آئے گا۔"

راجیو گاندھی کے اس مصالحانہ رویے کے پس منظر میں اسلامی بھائی چارے کے خوشگوار نظارے کے ساتھ ساتھ کچھ گرم گرم لہو بھی جھلکتا ہے۔ یہ لہو اُن شہیدوں کا ہے جنہوں نے اسی مسئلے پر احتجاج کرتے ہوئے کشمیر میں اپنی جانیں قربان کیں۔ یہ لہو پٹنہ میں اسلامی جمعیت طلبہ (STUDENTS ISLAMIC ORGANIZATION) کے اُن ۳۲ نوجوانوں کا ہے کہ جن کے پُرامن جلوس پر پولیس نے بہیمانہ فائرنگ کی۔ ایس آئی او کے ان نوجوانوں پر بھارتی پولیس نے اس قدر تشدد کیا کہ اُن میں سے اکثر ایسے ہیں جن کی ایک یا دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئیں۔ بہت سے ایسے ہیں کہ جن کے جسموں سے ابھی تک گولیاں نہیں نکالی جا سکیں۔ یہ جانفروش ابھی تک پٹنہ کے مختلف ہسپتالوں میں داخل ہیں۔ شاید انہی قربانیوں کا صلہ ہے کہ مختلف مکاتبِ فکر کے لوگ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو چکے ہیں۔ مردوں کے ساتھ ساتھ عورتیں اور بچے بھی اس محاذ پر پوری توانائیوں کے ساتھ سرگرمِ عمل نظر آتے ہیں۔ پٹنہ میں شدید زخمی ہونے والے ۲۸ سالہ شاہجہان کی اہلیہ بھی ان ہی میں سے ایک ہیں۔ اس خاتون کے شوہر کی ایک ٹانگ بُری طرح کچلی ہوئی ہے۔ مگر انہیں اس قربانی پر فخر ہے، ملال نہیں۔ ایک خط میں اس کا اظہار وہ یوں کرتی ہیں:

"ہم کو فخر ہے کہ ہمارے شوہر اسلام کی بقا کے لیے زخمی ہوئے ہیں اور بہنوں سے ہماری گذارش ہے کہ اپنے شوہروں کو اسلام کی راہ پر چلانے کی پوری پوری کوشش کریں۔" (خواجہ نسرین بانو۔ اہلیہ خواجہ شاہجہان)

تازہ ترین معلومات کا خلاصہ یہ ہے:۔

معروف بھارتی صحافی کلدیپ نیر کے مطابق بھارتی حکومت کے خلاف مسلمان اپنی "جنگ"

جیت گئے ہیں کہ مسلمانوں کے اتحاد کی برکت ہے کہ بھارتی حکومت نے مجبور ہو کر فیصلہ کر لیا ہے کہ ایسا قانون بنایا جائے جس سے آئندہ کے لیے مسلم پرسنل لا میں مداخلت کے امکانات ختم ہو جائیں۔ کلدیپ نیر کا کہنا ہے کہ اس مقصد کے لیے حکومت پارلیمنٹ کے آئندہ اجلاس میں بل پیش کرے گی۔ یہ بل نمائندہ علما اور مسلمان تنظیموں کے صلاح مشورے سے تیار کیا گیا ہے۔ نئے قانون کے ذریعے مطلقہ خاتون کی ذمہ داری اس کے والدین، بھائیوں اور دوسرے افراد خاندان پر ڈال جائے گی مسودۂ قانون میں بھارت کے آئین کی دفعہ ۱۲۵ اور ۱۲۶ میں ترامیم تجویز کی گئی ہیں۔

نئی "اخوان" جماعت کا مجوزہ قیام

مصر سے اطلاع ہے کہ اخوان المسلمون کے قائد جناب شیخ عمر تلمسانی بدلتے ہوئے حالات میں ایک نئی اسلامی سیاسی جماعت کے قیام کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مصر کی مسلم آبادی کی اکثریت اسلام سے گہری وابستگی رکھتی ہے۔ لیکن اپنے جذبات کے اظہار اور اپنے مقاصد کے فروغ کے لیے اس کے پاس کوئی پلیٹ فارم نہیں ہے۔ مصر کے موجودہ قوانین نے اس امر کی ضرورت اور بھی بڑھا دی ہے۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ اخوان کے دس ممبرانِ اسمبلی وفد پارٹی کے ٹکٹ پر انتخاب لڑ کر ایوان میں گئے ہیں، لیکن قانوناً جماعتِ اخوان کے سیاسی جماعت نہ ہونے کی وجہ سے وہ اخوان کے مطالبات اسمبلی میں نہیں اٹھا سکتے، نہ اخوان کے مقاصد اور لائحہ عمل کو فروغ دینے کے لیے کوئی کردار انجام دے سکتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ مشکلات کے باوجود اخوانی ارکانِ پارلیمان قوانینِ شریعت کے مطالبۂ نفاذ اور شراب نوشی اور فحاشی کے انسداد کی تحریکیں پیش کرنے کے لیے محاذ گرم رکھتے ہیں۔

اس وقت مصر میں عملاً یک جماعتی نظام ہے۔ اپوزیشن پارٹیاں موجود ہیں اور حکومت کی پالیسیوں کے اختلافات کا عملی اظہار بھی ہوتا ہے، لیکن سرکاری سطح پر اپوزیشن پارٹیوں کا وجود نہیں حال ہی میں مصر کی اپوزیشن جماعتوں نے مطالبہ کیا ہے کہ انتخابات کے موجودہ قوانین تبدیل کر دیئے جائیں تاکہ ہر مکتبِ فکر اپنی پارٹی کے جھنڈے تلے اسمبلی میں پہنچے اور اپنی آزادانہ رائے کے اظہار کا موقع ملے اور ملک کو جابرانہ نظام سے نجات مل سکے۔

برما کے مظلوم مسلمان

برما کے مسلمانوں کی آزمائش جاری ہے۔ آٹھ برس پہلے نیون انتظامیہ

نے صوبہ اراکان میں آباد مسلمانوں پر فوج کشی کی جس کے نتیجے میں ہزاروں بے گناہ شہید ہوئے۔ ہزاروں بھاگتے ہوئے راہوں میں مصائب کی تاب نہ لا کر چل بسے اور تیس ہزار سے زیادہ افراد ہجرت کر کے ہمسایہ ملک بنگلہ دیش میں پناہ گزین ہو گئے۔ اس کے بعد سے مظالم کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ ۱۹۸۲ء میں ایک قانون کے ذریعے مسلمانوں کو برما کی شہریت سے کلی طور پر محروم کر دیا گیا۔ اراکان کی مسلم قوم "روہنگی" کو نوٹس دیا گیا کہ وہ یا تو ثابت کرے کہ گذشتہ دو سو برس سے برما میں رہتی بستی چلی آئی ہے یا ملک چھوڑ کر چلی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ روہنگی برما کی قدیم ترین قوم ہیں، لیکن ان کے تمام دعوے باطل قرار پائے کہ وہ مسلمان تھے۔ غیر ملکی قرار دینے کے بعد مسلمانوں پر مظالم کے نئے طوفان ٹوٹنے لگے۔

حکومت نے حکم دیا کہ تمام غیر ملکیوں (مسلمانوں) سے وہ اراضی اور جائیداد چھین لی جائے جس پر (صدیوں سے) ان کا قبضہ ہے۔ جنہوں نے سرکاری حکم ماننے سے انکار کیا، انہیں جیلوں اور عقوبت خانوں میں ڈال کر ان پر کوڑے برسائے گئے۔ کچھ پولیس اور فوج کے مظالم سے ڈر کر گھروں کو چھوڑ کر جنگلوں میں بھٹکنے لگے۔ یہاں بھی فوجیوں نے ان کا تعاقب کیا تو ہجرت کر کے ہمسایہ ملک کے جنگلوں میں پناہ گزین ہو گئے۔ کچھ پاکستان اور خلیجی ریاستوں تک پہنچے۔ تھوڑی سی تعداد بھارت بھی گئی۔ انہیں بھارتی پولیس نے پکڑ لیا۔ آج بھی بھارتی جیل کیتھیار میں بہت سے برمی مسلمان قید ہیں۔ متعدد درخواستوں کے باوجود بھارتی حکومت نے ان کی مجبوری اور بے گناہی تسلیم نہیں کی۔

لاکھوں مسلمان ابھی تک برما میں موجود ہیں۔ ان کے خلاف ظلم کی کارروائی کی جا رہی ہے۔ زمینوں سے بے دخل کرنے کے بعد انہیں نقد رقوم اور کرنسی نوٹوں سے بھی محروم کر دیا گیا ہے۔ گذشتہ سال حکومت نے اعلان کیا کہ ۱۰۰، ۵۰ اور ۲۰ کیات کے نوٹ منسوخ کر دیے گئے ہیں۔ تمام لوگ اپنے کرنسی نوٹ خزانے میں جمع کرا دیں۔ اس کے بدلے میں انہیں نئے نوٹ دیے جائیں گے۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۸۵ء کرنسی نوٹ جمع کرانے کی آخری تاریخ تھی۔ یہ تمام کارروائی مسلمانوں کو بے دست و پا کرنے کے لیے کی گئی تھی۔ باقی لوگوں کو تو نئے نوٹ جاری کر دیے گئے۔ لیکن مسلمانوں سے کہا گیا کہ وہ صرف قومی رجسٹریشن سرٹیفکیٹ پیش کر کے معاوضہ حاصل کر سکتے

ہیں۔ شہریت سے تو وہ پہلے ہی محروم تھے، یوں برسوں کی جمع پونجی سے بھی محروم کر دیئے گئے ہیں۔

سنگاپور میں "تعمیر" اور "تخریب"

سنگاپور کی اسلامی تبلیغی تنظیم "جمعیت" نے اپنی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر نئے اسلامی مرکز کا افتتاح کیا ہے۔ یہ چار منزلہ مرکز تیس لاکھ ڈالر (تقریباً پانچ کروڑ روپے) کی لاگت سے تیار ہوا ہے۔ اس کی تعمیر کے لیے دُنیا بھر کی اسلامی تنظیموں اور حکومتوں نے عطیات دیئے جب کہ کل اخراجات کا ایک تہائی ایک مقامی مسلمان خاتون حاجہ نامن بی نے مہیا کیا۔

"جمعیت" سنگاپور کے مسلمانوں کی واحد غیر سرکاری تنظیم ہے جس کے اراکین اور ممبران کی تعداد پچیس ہزار سے زیادہ ہے۔ اپنی محدود مالی صلاحیتوں اور وسائل کے باوجود اس تنظیم کے جزیرے پر گہرے اثرات پڑ رہے ہیں۔ وہ حکومت کے سامنے مسلمانوں کے مختلف مسائل اور مطالبات پیش کرتی اور انہیں حل کراتی ہے۔ ان دنوں جمعیت حکومت کے سامنے دو مطالبات پیش کر رہی ہے۔ پہلا مطالبہ آئین میں اس ترمیم سے واپسی کا ہے جس کے تحت مسلم مرد کو غیر مسلم عورت سے شادی کی اجازت مل گئی ہے۔ ایسی شادیاں باقاعدہ نکاح کے بغیر اور سول میرج کے ذریعے کر سکنے کی آزادی بھی دی گئی ہے۔ دوسرا مطالبہ مسجد انگولیا پارک کے انہدام کے حکومتی فیصلے کے خلاف ہے۔ جمعیت کے علاوہ مسجد کمیٹی کے صدر عبدالقادر بجاج اور کئی دوسرے مسلم رہنماؤں نے حکومت کو لکھا ہے کہ مذکورہ مسجد کو منہدم کر کے تجارتی علاقے کو وسیع کرنے کی تجویز واپس لی جائے۔ معلوم ہوا ہے کہ حکومت اس سے پہلے ایلس روڈ پر واقع مسجد اور پایاگو بینگ کی مسجد کو منہدم کر چکی ہے۔

اس معاملے کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ حکومت میں شامل کچھ نام نہاد مسلمان مساجد کے انہدام کے فیصلے سے متفق ہیں۔ وہ حکومت کے اس موقف سے اختلاف نہیں رکھتے کہ محدود شہری اراضی میں سرکاری علاقوں کی توسیع کے لیے ان مساجد کا انہدام ضروری ہے۔ سنگاپور کے شہری اس پر متحد ہو کر احتجاج کر رہے ہیں۔